توافق لِلبقا

مغرب کے نظریۂ ارتقاء پر ایک تعمیری تنقید

(۲)

از جناب نعیم صدیقی

کیا بقا و ارتقائے حیات محض تصادم ہی کا مرہونِ منت ہے؟

فلسفۂ ارتقاء کا تیسرا اصول یہ پیش کیا گیا ہے کہ زندگی کا ارتقاء تنازع (Struggle) ہی کے بل پر ہوتا ہے۔ یہ اصول بھی دراصل حیوانی زندگی سے اخذ کیا گیا تھا لیکن آگے چل کر اسے انسانی زندگی پر بھی پھیلا دیا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تمدنی ارتقاء کا فلسفہ جس دور میں مدون ہوا اس دور میں انسان عملاً حیوانات کی سطح پر گر چکا تھا۔ وہ اپنی حقیقی امتیازی حیثیت یعنی اپنی اخلاقیت اور ذمہ داری کو بھول گیا تھا اور اپنے اوپر کسی اقتدارِ بالادست کی موجودگی کا قائل نہیں تھا۔ زندگی بعد الموت کا منکر ہونے کی وجہ سے اس نے لذت اندوزی اور خواہش پرستی کو مقصدِ حیات ٹھہرا لیا تھا اور اجتماعیت کے بجائے وہ انفرادیت کی طرف جھک پڑا تھا۔ مختصر یہ کہ اس میں اور ادنیٰ حیوانات میں بجز اس کے کچھ فرق نہیں تھا کہ یہ اپنی خواہشات کی غلامی کرنے میں اپنے عقلی قویٰ کی مدد سے کچھ زیادہ کارہائے نمایاں دکھا رہا تھا۔ اس بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علمائے مدنیات نے انسان کو اگر حیوانات کے ساتھ ملا کر اس کا مطالعہ کیا تو وہ کچھ زیادہ غلطی پر نہ تھے۔ ان کی غلطی اگر تھی تو یہ تھی کہ انھوں نے ایک غیر فطری حالت کو فطری حالت قرار دے لیا اور انسان نے جو اجتماعی امراض پیدا کر لیے تھے انھیں علاماتِ صحت سمجھ لیا۔

اس غلط اندیشی سے یہ تصور پیدا ہوا کہ جس طرح ایک بیل ہری ہری گھاس کے لیے دوسرے بیل سے لڑ جاتا ہے اسی طرح انسان کو ایک دوسرے سے نوالے چھیننے چاہییں۔ پھر جس طرح چیتوں کی ایک ٹولی جس جنگل میں چاہتی ہے شکار کرتی پھرتی ہے اسی طرح انسانی گروہوں کو بھی بین الاقوامی سیاسی صیادی کرتے پھرنا چاہیے۔ انسان کا گویا فطری منصب ہی یہ قرار پایا کہ وہ بحیثیتِ فرد افراد سے الجھا رہے اور طبقات اور اقوام کی شکل میں منقسم ہونے کی حیثیت سے دوسرے طبقات اور دوسری اقوام سے متصادم رہے، ورنہ وہ ارتقاء نہیں کر سکتا، بلکہ اس کی بقا تک ممکن نہیں ہے۔

زندگی کا کتنا ایک رخا مطالعہ تھا۔ ان لوگوں نے زندگی میں تنازع کے اصول کی کارفرمائی تو دیکھ لی مگر "توافق للبقاء" (Co-operation for existence) کے اصول کو نہ دیکھ سکے جو سورج سے زیادہ نمایاں تھا۔ توافق للبقاء کی اصطلاح سے شاید آپ اُبرا رہے ہوں کہ یہ کیا بلا ہے مگر یہ اتنی عام اور صریح حقیقت ہے کہ کششِ زمین کی طرح محض پیش پا افتادہ ہونے کی وجہ سے کسی کو محسوس نہ ہوئی۔ اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ اس کے بغیر تمدن کی گاڑی ایک انچ بھی نہیں چل سکتی۔ نہ صرف یہ کہ مدنیت کا محل اسی سنگِ اساس پر کھڑا ہے بلکہ کائنات کی کائنات توافق کی شاہ راہ پر اپنی منزلِ تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اس اشارے کا مدعا یہ نہیں کہ کائنات میں صرف "توافق للبقاء" کا اصول ہی کام کر رہا ہے اور "تنازع" کا کوئی موقع و مقام ہے ہی نہیں، ان دونوں اصولوں سے فطرت برابر کام لیتی ہے۔ "تنازع" یقیناً ایک محرک کی حیثیت سے کام کرنے والی زبردست قوت ہے مگر زندگی کی حرکت کا ارتقائی حرکت ہونا درحقیقت اصولِ توافق ہی کا مرہونِ منت ہے۔ یک چشم "عقل" نے تنازع کو تو پا لیا مگر توافق کی آیات کو دیکھے بغیر گذر گئی۔

پیشتر اس کے کہ ہم انسان کی تمدنی و اخلاقی زندگی میں اصول توافق کی کارفرمائی کا مطالعہ کریں، انسب یہ ہوگا کہ کائنات کے طبیعی اور حیوانی پہلوؤں کا ایک جائزہ لیتے چلیں۔ جی چاہتا ہے کہ علامہ اقبال کا نظریہ کائنات یہاں تمہیداً پیش کر دیا جائے۔ جاوید نامہ میں ہے:۔

گم شدم اندر ضمیرِ کائنات ! — چوں رباب آمد بہ چشمِ من حیات
آنکہ ہر تارش ربابِ دیگرے — ہر نوا از دیگرے خونیں ترے
ما ہمہ یک دودمان نار و نور — آدم و مہر و مہ و جبریل و حور

یہ ٹکڑا کم سے کم الفاظ میں حقیقت کائنات کو پیش کر دینے کی ایک شاندار مثال ہے۔ زندگی ایک رباب ہے جس کا ہر تار بجائے خود ایک مستقل ساز ہے مگر ہر تار اپنا مستقل وجود رکھنے اور ایک جداگانہ امتیازی آواز پیدا کرنے کے باوجود دوسرے تاروں سے حد درجہ ہم آہنگ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ربابِ ہستی کی ایک نوا دوسری سے زیادہ "خونیں تر" ہے۔ اس رباب سے باریک سے باریک آوازیں اور کرخت سے کرخت صدائیں بیک وقت نکل رہی ہیں مگر ایک دوسرے میں مدغم ہو کر۔ ان کا سارا تنوع وحدت کے روپ میں نمایاں ہوتا ہے اور ایک ساز کی شان یہی ہے یہ جو جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کی تقسیم ہمیں محسوس ہوتی ہے اس کے پس پردہ بھی وحدت کام کر رہی ہے۔ یہ سب اتنے متوافق ہیں اور ایک دوسرے کے حفظ و بقا میں ایسے سرگرم ہیں کہ انھیں ایک خاندان کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک کارخانہ کے اندر کام کرنے والی مختلف مشینیں ہیں جو ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور پھر متعاون بھی۔ چلیے اب اس لطیفے کی گہرائی میں اتریں۔

اس خاندان کا بلحاظ جسامت و اظہارِ وجود سب سے ادنیٰ اور بلحاظ اہمیت سب سے برتر شریک وہ ننھا دیو ہے جسے آپ سالمہ (Atom) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک چھوٹی سی کائنات ہے۔ ایک مثبت برقیہ (Proton) وسط میں مرکز بنا ہوا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ منفی برقیے (Electrons) اس کے گرد کولھو کے بیل بنے ہوئے گھومے چلے جا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ منفی اور مثبت برقیے آپس میں رشتہ تضاد رکھتے ہیں۔ اور ان کا یہ رشتہ تضاد ہی سالمے کی غیر محسوس کائنات میں حرکت اور حرارت کو برقرار رکھتا ہے مگر اس کے باوجود یہ آپس میں متوافق و ہم آہنگ بھی ہیں یعنی دونوں مل کر ایک مشترک نظم بناتے ہیں تاکہ "ہائیڈروجن سے لیکر یورنیم Uranium تک مختلف "جوہر" وجود میں آتے رہیں اور تعمیرِ کائنات اور خدمتِ حیات میں صرف ہوں۔ اگر برقیوں کے درمیان صرف تضاد ہی ہوتا اور توافق نہ ہوتا تو وہ ایک دوسرے کو ختم کر کے رکھ دیتے اور ان کے باہمی عمل و تعامل سے وجود کا قدم آگے نہ اٹھ سکتا۔

پھر جواہر کو دیکھیے تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے اور یہ اختلاف ان میں تصادم کا موجب بھی ہوتا ہے کیونکہ تصادم ہی امتیازی وجود کا اعلان و اظہار ہے۔ مگر ان کے درمیان صرف تصادم ہی تصادم واقع نہیں ہوتا بلکہ یہ توافق کے بل پر وجود کے بہتر سے بہتر روپ کی تخلیق کرتے ہیں اور ان [illegible] ایک دوسرے کے لیے کمال درجہ کا "ایثار و تعاون" پایا جاتا ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن دو مختلف جوہر ہیں۔ ان دونوں کا کوئی میل نہیں ہے مگر جب ان میں "کیمیاوی مناکحت" واقع ہوتی ہے تو اس میں تصادم کی جھلک صرف اس پہلو سے نظر آتی ہے کہ ان زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے امتیازی وجود کو ختم کر دیتا ہے۔ لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ان کے ملاپ سے "پانی" جیسی اہم چیز وجود پاتی ہے اور یہی پہلو

توافق کا مظہر ہے۔ اختلاف و تضاد نے باہمی تعامل کا موقع پیدا کیا اور توافق نے اس تعامل کو ایک اعلیٰ تر نتیجہ تک پہنچا دیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اختلاف جواہر سے جو تصادم پیدا ہوتا ہے وہ "تغیر" (Change) کا سبب بنتا ہے جو کائنات کا ایک لازمی وصف ہے۔ مگر تغیر کو بہتر پیرایہ اگر ملتا ہے تو جواہر کے توافق سے جو نظم کی جڑ ہے اور ارتقا کا ذمہ دار۔ اگر کائنات کے اجزا میں محض تصادم ہوتا تو اس سے تغیرات تو شائد رونما ہوتے رہتے لیکن ان تغیرات کا رخ تکمیل و تعمیر کی طرف نہیں بلکہ تعطیل و تخریب کی طرف ہوتا۔ اجزا کے توافق و تعاون کے تصور کو الگ رکھ کر تو ہم تغیرات میں رشتۂ تعلیل کا امکان فرض نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں تو حوادث کے لیے بے راہ روی لازمی صفت ٹھہرتی ہے۔ کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ حوادث کی بے ضابطگی زندگی کو نمو دے سکتی اور اسے ترقی کی راہ پر لے جا سکتی ہے؟ ضابطہ کیا ہے؟ یقیناً اسی کا دوسرا نام توافق و ہم آہنگی ہے۔

ہمارا میدان تفکر و تدبر یہاں ختم نہیں ہوتا۔ ابھی کتاب حقائق کے ہزاروں ابواب پڑے ہیں۔ قوت اور حرارت اور روشنی کے سرچشمہ کو دیکھیے اس کے چاروں طرف لاکھوں کروں کو اپنے گھوارے میں لیے ہوئے جو فضا پھیلی ہے وہ سورج سے قوت و حرارت اور روشنی چھینتی چلی جا رہی ہے۔ مگر اس "تنازع" سے آگے پھر "توافق" کا عمل واقع ہونے لگتا ہے۔ یہ قوت، نور اور حرارت کا خزانہ مختلف کروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور مختلف موجودات کی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس تقسیم قویٰ کے نظام کے عمق میں اتریں تو کچھ اور ہی آیات توافق سامنے آتی ہیں۔ ان قوتوں کو موجودات صرف اپنی ضرورت اور گنجائش کی حد تک قبول کرتی ہیں اور مابقی جو ان تک پہنچتا ہے اسے لوٹا دیتی ہیں تاکہ دوسروں کے کام آئے۔ قوت کی ہر رمق، گرمی کا ہر "خفیفہ" (چھوٹی سے چھوٹی مقدار) اور روشنی کی ہر کرن جس کا فی الواقع کسی وجود میں مصرف موجود نہ ہو دیانتداری سے واپس کر دیا جاتا ہے۔ اور فضا، ہوا، اور ایتھر اسے کسی مصرف تک پہنچا دینے کے لیے نہایت حفاظت سے اِدھر سے اُدھر لیے پھرتے ہیں۔ اور پھر جتنا حصہ قوتوں میں سے قبول کیا جاتا ہے اس کو بھی ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ اسے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جو قوت ایک وجود سے خارج ہوتی ہے اسے بڑھ کر دوسرا سنبھال لیتا ہے اور جہاں وہ اپنی ایک مخصوص صورت میں فنا ہو جاتی ہے وہاں کسی دوسری شکل میں معاً جلوہ گر بھی ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو سمجھ کر "عمل اور ردعمل" (Action and reaction) کا نام دیا گیا ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اشیاء میں چند پیچیدہ اور نازک معاہدے عمل میں آ چکے ہیں اور ان معاہدوں کی پابندی کے لیے گویا انھوں نے کسی روح القویٰ کے سامنے بنیادی "حلف وفاداری" لے رکھا ہے۔ اسی حلف وفاداری کو پورا کرنے کے لیے موجودات "جان" دینے تک پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ الہامی مذہب اسے عہد نامۂ عبدیت سے تعبیر کرتے ہیں جو مخلوقات فطرت کی زبان سے خالق کے سامنے ہمہ وقت دہرا رہے ہیں اور اس کی عملی پابندی میں مصروف ہیں۔

قرآن اسی حقیقت کو اپنی مخصوص زبان میں یوں بیان کرتا ہے:۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کی تسبیح زبان حال سے کر رہی ہے اور ہمہ تن اسی کے آگے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔

بہر حال ظاہری اختلافاتِ موجودات سے جو تصادم عمل میں آتے ہیں وہ ان کی باطنی یک رنگی پر مبنی توافق کی راہ پکڑ لیتے ہیں اور اس طرح کائنات میں وہ عمل واقع ہوتا ہے جسے ارتقا کہا جاتا ہے۔ گرمی پانی کو بخارات میں بدلتی ہے، بخارات کا ہلکا پن کشش زمین کا زور کم کر دیتا ہے اور وہ فضا میں اوپر کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ وہاں برودت اپنا قرض ادا کرنے کے لیے پہلے سے موجود ہوتی ہے وہ انھیں پھر پانی بنا دیتی ہے۔ اس عمل میں قوتوں اور عناصر کے جوڑوں میں جتنے تصادم واقع ہوتے ہیں ان سب میں ایک توافق جلوہ گر ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ بارش کی

مشین چل رہی ہے اور پورے کرۂ ارضی پر پانی کے انتقال اور بہم رسانی کا نظام جاری ہے۔ اگر گرمی کی مشین، ہوا کی مشین، پانی کی مشین میں توافق کارفرما نہ ہوتا تو سورج چمکتا رہتا مگر پانی اس سے گرم نہ ہونے پاتا اور اگر پانی گرم ہو نکلتا تو بخارات بننے سے انکار کر دیتا، یا اگر بخارات بنتے تو زمین انھیں اوپر کی طرف جانے میں مانع ہوتی۔ یا ہوا انھیں ادھر ادھر حرکت نہ دے سکتی یا بخارات پھر سے پانی بن جانے سے انکار کر بیٹھتے۔ پھر سب کچھ اگر ہو بھی جاتا تو ممکن ہے کہ برسا ہوا پانی بہنے اور زمین میں جذب ہونے پر تیار نہ ہوتا۔ اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ نہ کہیں نباتات کا نام و نشان مل سکتا، نہ "امیبا بہادر" ظہور پا سکتے، نہ "بندر" نظر آ سکتے اور نہ ڈارون ہی ہوتے کہ اپنا "شجرۂ نسب" متعین کرنے میں سرگرداں نظر آتے۔

ہر کدال جو زمین پر اپنا عمل کرتی ہے دراصل زمین سے تصادم ہی کرتی ہے اور کدال کے عمل میں جو زور خرچ ہوتا ہے اور لوہے پر جو چوٹیں پڑتی ہیں وہ زمین کا جوابی تصادم ہی ہوتا ہے مگر یہ تصادم توافق اس حیثیت سے بن جاتا ہے کہ دونوں مل ایک بہتر نتیجہ کی طرف پیشقدمی کرتے ہیں۔ کچھ تکلیف کدال کو برداشت کرنی پڑتی ہے اور کچھ قربانی زمین پیش کرتی ہے اور اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ زمین کی قوتِ روئیدگی بڑھتی ہے یعنی اسے کام کرنے کا زیادہ بہتر موقع فراہم ہوتا ہے۔ پھر ہر بیج جو زمین میں قرار پاتا ہے اسے مٹی کی تہ نیچے دبائے رکھتی ہے یہی دباؤ اس کی قوتِ نمو کو اکساتا ہے۔ ایک کونپل نکلتی ہے مٹی کا سینہ چیرتی ہے، ابھرتی ہے اور تناور درخت بننے لگ جاتی ہے۔

اشیا اور قوتیں اگر متوافق ہونے پر راضی نہ ہوتیں تو جناب من آپ ایک ادنیٰ سا کیمیاوی مرکب نہ بنا سکتے، کیونکہ کوئی سے دو عناصر آمیزش پر راضی ہی نہ ہوتے بلکہ آپ ہوتے ہی کہاں؟ جبکہ آپ کا مادی وجود بھی عناصر ہی کی ہم آہنگی کا ایک نتیجہ ہے۔

یہ تو تھا طبعیات کا عجائب خانہ، ذرا اجسام نامیہ کے لالہ زار میں در آئیے اور دیکھیے کہ عمل تصادم کے پہلو بہ پہلو کس طرح اصول توافق کام کرتا ہے۔ کس طرح جمادات نباتات کی زندگی جاری رکھنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہیں۔ پھر کس طرح نباتات حیوانات کی خدمت پر کمربستہ ہیں۔ پھر کس طرح حیوانات خود نباتات کی خدمت کرتے ہیں۔ نباتات حیوانات کے لیے آکسیجن کی فراہمی میں کمربستہ ہیں، حیوانات ان سے آکسیجن لیتے اور انھیں "قیمت" میں نائٹروجن اور کاربانک ایسڈ گیس سپلائی کرتے ہیں۔ نباتات حیوانات کے بدن کی تعمیر کے لیے اپنی متاع لٹانے کو حاضر رہتے ہیں اور ادھر تتلیاں اور پرندے اور کیڑے کوڑے خود نباتات کی نسل پھیلانے میں اپنی خدمات مصروف رکھتے ہیں۔ مزا یہ کہ اساسی عناصر زندگی کی ان ساری شکلوں کو پرورش دینے کے باوجود برقرار رہتے ہیں۔ بس اتنی بات ضرور ہے کہ یہ ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ عناصر گویا فطرت کا کاروبار میں لگا ہوا "سرمایہ" ہیں۔ یہ ہر گردش کے بعد منافع میں زندگی کی برتر اشکال لے کر آ حاضر ہوتے ہیں اور پھر دوسری نئی گردش کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں

اب ذرا حیوانات کی نیم شعوری زندگی کے چمنستان میں گلگشتِ اسرار و رموز کے لیے قدم آگے بڑھائیے۔ دیکھیے ان میں "توافق للبقاء" کا اصول کس طرح کام کرتا ہے۔ آپ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ برتر قسم کے حیوانات گلہ بندی کر کے زندگی گذارتے ہیں۔ جنگلی گایوں، ہرنوں، بندروں اور پرندوں کو غول بن کے رہنے کا ڈھنگ توافق للبقا ہی نے سکھایا ہے۔ اپنے گروہ کے مفاد کے لیے انفرادی نقصان اٹھا لینا، ہم غول رفیقوں کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ احترام کرنا اور کچھ موٹے موٹے گروہی ضوابط کی پابندی کرنا یہ آخر کیا چیز ہے؟ یہ نظم و توافق ہے جو بقا و ارتقا کے لیے ناگزیر ہے۔ حیوانات کی ہر ایک نوع میں ایک نوعی رشتہ کام کرتا ہے، پھر ان کے گروہوں میں ایک گروہی ہم آہنگی ہوتی ہے اور پھر ان کے کنبے کنبے میں ایک خاندانی توافق ہوتا ہے۔ پھر اچھی قسم کے حیوانات کے "زوجین" میں آپ توافق کی کارفرمائی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ مادہ نر کے لیے سرمایۂ تسکین بنتی ہے اور نر اس کی نگہبانی اور معاشی معاونت کا فرض انجام دیتا ہے تاکہ وہ نسل کشی کے فطری فریضہ کی ادائیگی میں کمربستہ رہے۔ ان دونوں پہلوؤں یعنی خاندان بندی اور گلہ بندی کے لحاظ سے جو حیوانات آگے بڑھتے رہے ہیں ان کی زندگیاں نسبتہً برتر قسم کی ہیں اور ان میں بقا و استحکام زیادہ ہے۔

اور یہ ارتقاء کی راہ پر مقابلتہً کچھ زیادہ تیز رفتاری سے حرکت کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جو حیوانات اجتماعیت اور خاندانیت سے گریز رکھتے ہیں ان کی بقا معرضِ خطر میں اور ان کی رفتارِ ارتقاء نسبتہً سست ہے۔ یعنی وہ مقدم الذکر سے بہت پیچھے ہیں، چاہے بظاہر ان کی جسامتیں اور اعضا بہت بڑے اور قوی تر ہی کیوں نہ ہوں۔

اب ہم اس منزل پر آ پہنچے ہیں کہ حضرتِ انسان کی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ ان کی زندگی میں اصول توافق کیا کام کرتا ہے۔ انسان کی عام حیوانی و طبیعی زندگی میں اصول توافق کا جو عمل دخل ہے اس کا اندازہ اوپر کی توضیحات سے کیا جا سکتا ہے۔ اب یہاں ضرورت صرف نظمِ مدنیت پر توجہ کرنے کی ہے۔ "تنازع للبقاء" کے مبلغین شاید یہ سن کر ہکا بکا رہ جائیں گے کہ مدنیت کی "بسم اللہ" توافق للبقاء کے اصول سے ہوتی ہے۔ اور اس کا سارا نشوو ارتقاء توافق ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ یہاں بھی افراد کے مثبت (نر) اور منفی (مادہ) برقیے متوافق ہو کر خاندانوں کے رنگا رنگ "جواہر" کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر خاندانوں کے مختلف جوہر ترکیب پا کر اقوام و ملل کو وجود دیتے ہیں جن کے باہمی عمل و تعامل سے کائناتِ انسانیت ارتقاء کی راہ پر متحرک ہوتی ہے۔ تنازع و تصادم یہاں بھی ایک عامل محرک کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور کسی مقام پر اس کا ظہور انسان کو اس امر کی اطلاع دیتا ہے کہ اب یہاں ضرورت ہے توافق کی۔ پس توافق رونما ہوا اور ارتقاء ہونے لگا۔

آدمی کو مدنی الطبع کہا جاتا ہے۔ مراد یہ کہ اس کے اندر عام حیوانات کے مقابلہ میں توافق کے رجحانات زیادہ زور پر ہیں۔ جمادات میں یہ رجحانات شعوری نہیں بلکہ طبعی ہیں۔ نباتات میں یہ "شعورِ غنودہ" کے پسِ پردہ کام کرتے ہیں اور حیوانات میں نیم شعوریت ان کا جامہ ہے مگر انسان میں ترقی یافتہ شعور ان کا آلۂ کار بنتا ہے۔

وہی صنفی اور معاشی جذبات جو ادنیٰ حیوانات کو "انارکی" سے کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھا سکتے، انسان کو اجتماعیت اور توافق سکھلاتے ہیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ادنیٰ حیوانات میں صنفی جذبہ بالکل وقتی اور موسمی ہوتا ہے۔ یہ وقت اور موسم گذرا اور نر و مادہ کا ربط کمزور ہوا۔ مگر انسان میں صنفی میلانات دوامی اور بے موسمی ہیں۔ یہاں نر و مادہ وقتی لذت اندوزی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک مستقل باہمی رفاقت و معیت چاہتے ہیں۔ نہ صرف یہ انسان کا جذبۂ محبت و معیت بجائے خود زیادہ عمیق واقع ہوا ہے اور مناظرِ فطرت اسے پیہم اکساتے رہتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور خارجی فطری داعیات بھی ایسے ہیں کہ وہ آدمی کو "من تو شدم تو من شدی" کی پٹی پڑھاتے رہتے ہیں۔ مادہ جب بارور ہوتی ہے تو زمانۂ حمل اس کے لیے نصف مرض بن کر آتا ہے، پھر اس پر زچگی کی قیامت گذرتی ہے، پھر رضاعت کے طویل زمانہ کے لیے بچہ اس کے پاؤں کی بیڑی بن جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ حیوانات کے بچوں کے مقابلہ میں بہت طویل عرصہ تک اس ابتدائی سمجھ بوجھ کا مالک بھی نہیں ہوتا جو ایک جاندار کے لیے عموماً اور ابنِ آدم کے لیے خصوصاً اس کائنات میں جی جانے کے لیے اشد ضروری ہے۔ بدیں وجہ ماں کو اولاد کی تربیت کی مہم لے بیٹھتی ہے۔ اس صورتِ حالات کی وجہ سے عورت کا معاشی انحصار بہت حد تک مرد پر ہو جاتا ہے اور وہ وقتی ربط کے بجائے مستقل وابستگی و تعاون کی محتاج ہوتی ہے۔ اس طرح مرد اور عورت کی باہم وابستگی سے توافق للبقاء کا اصول عمل میں آتا ہے۔ پھر جب ایک جوڑے کی اولاد پھیلتی ہے تو خاندان کا ادارہ وجود پاتا ہے۔ یہ ادارہ توافق للبقاء کا نمایاں ترین مظہر ہے۔

ابتدا میں خاندان جہاں اندرونی طور پر توافق للبقاء پر عمل پیرا ہوتے تھے وہاں دوسرے خاندانوں کے ساتھ جن میں سے ہر ایک مستقل اور جداگانہ ہستی تھا، ان کا معاملہ بالعموم تنازع للبقاء کے اصول پر تھا۔ آگے چل کر تعاون و توافق کے دائرے کو مزید پھیلا دیا گیا اور قبیلے نسلی اور وطنی قومیتوں میں مدغم ہو گئے۔ اب تنازع للبقاء کا عمل قوموں اور قوموں کے درمیان جاری ہو گیا۔ اسی مرحلہ پر عرب سے وحدتِ انسانیت کے علمبردار اٹھے جو پوری نوع کو توافق کے اصول پر ایک خاندان بنا دینا چاہتے تھے مگر دنیا کی بدقسمتی کہ یہ تحریک اگرچہ اتنے گہرے اثرات چھوڑ گئی کہ بار بار اس کا ظہور ہوتا رہا اور

ہوتا رہے گا، مگر بین الاقوامی دور کے آغاز میں اسے پوری دنیا پر غلبہ حاصل نہ ہو سکا۔ چنانچہ ابھی تک قومی توافق اور بین الاقوامی تنازع کی حالت جاری ہے اور ہماری ارتقائی حرکت ایک خاص نقطہ پر آ کر رک گئی ہے۔

خیر تو اب انسان اور حیوان کے معاشی رجحانات کے فرق کو ملاحظہ فرمائیے۔ حیوان کی خواہشات محدود ہیں مگر انسان کی ضروریات وسیع ہیں۔ حیوان چند مقررہ ضروریات کو حاصل کر لینے پر اکتفا کرتا ہے مگر آدمی کا دماغ ایک ضرورت کے پورا ہونے پر نئی نئی ضرورتیں پیدا کرتا ہے اور مستقبل پر نظر رکھنے کی وجہ سے ذخیرہ اندوزی بھی کیا کرتا ہے۔ پھر حیوان "ذوق جمال" سے محروم ہے مگر انسان کا ذوق جمال اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کو بہتر سے بہتر پیرائے میں پورا کرے۔ انھیں فروق کی بنا پر انسان آغاز تمدن ہی میں اپنی اور اپنے کنبہ کی ساری ضروریات کو پورا کرنے سے عاجز آگیا اور وہ تقسیم کار کے اصول پر دوسرے ابنائے نوع کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کسی نے کاشت کا کام سنبھالا، کسی نے شکار کے آلات بنانے کا ذمہ لیا، کسی نے بڑھئی بن کر اپنی خدمات پیش کر دیں، کسی نے لباس تیار کرنا اپنے ذمے لیا اور اس طرح بستیاں بسنے لگیں۔ پھر تمدن کی پیش قدمی اور نسل انسانی کی افزائش سے یہ بستیاں شہروں میں تبدیل ہوئیں۔ پھر ذرائع آمد و رفت نے انھیں ایک رشتہ میں پرونا شروع کیا اور آج یہ حال ہے کہ سائنس نے سمندروں اور اونچے پہاڑوں جیسے خوفناک حائلات کو بے اثر بنا کر پوری دنیا کو ایک "گھر" میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ سارا سفر جو طے ہوا، یہ آخر توافق للبقا کی شاہراہ پر ہی تو ہوا ہے۔

میں یہاں پھر یہ کہہ دوں کہ اس بیان کا مطلب عرصۂ حیات میں تنازع و تصادم کی جولانیوں کا انکار کرنا نہیں ہے۔ اس تصادم کے علاوہ جو نظم کائنات اور فطرت انسانی کے درمیان روز اول سے جاری ہے، قبائلی دور میں قبیلوں کے اور قومی دور میں قوموں کے درمیان بلکہ خود قبیلوں کے اندر بھی افراد اور افراد میں اور قوموں کے اندر طبقات اور پارٹیوں میں کسی نہ کسی پیمانہ پر کشمکش ہوتی رہی ہے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ آدمی کی ذہنیت متضاد قوتوں کی جولانگاہ ہے، وہ مدنیت و اجتماع کے داعیات سے بھی مسلح ہے اور انار کی اور تفرد کے رجحانات سے بھی مزین ہے۔ چنانچہ اس کی ذہنی کشمکش کا اثر سوسائٹی کے ہر گوشے میں نمودار ہوتا رہا ہے۔ جو چیز یہاں پیش کی جا رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ انسانی زندگی میں "تنازع" صرف ایک محرک قوت ہے اور "توافق" حرکت حیات کو اجتماعیت کے رخ پر لے جا رہا ہے۔ سوسائٹی صرف توافق کے بل پر وجود پاتی اور نشو و نما حاصل کرتی ہے اور ترقی کے مونٹ ایورسٹ پر چڑھنے کا زینہ یہی ہے۔ توافق کی جگہ سوسائٹی میں جب "تصادم" ہوتا ہے تو ارتقا رک جاتا ہے اور تصادم کا ہونا ہی گویا اس امر کا اعلان ہے کہ یہاں توافق کی ضرورت درپیش ہے۔

اگر آپ مزید تفصیل میں جائیں تو اس دعوے کی صداقت اور بھی مسلم ہو گی۔ اگر سوسائٹی کا تجزیہ کیا جائے تو توافق کی کارفرمائی زیادہ اچھی طرح محسوس ہونے لگی ہے۔ سوسائٹی نام ہے "اخلاقی شعور" اور "قانونی نظم" کا۔ اب ان دونوں کی حقیقت پر غور کیجیے: قانونی نظم کیا ہے؟ کسی جمعیت انسانی کی "اکائیوں" کے حقوق کا تحفظ۔ مگر یہ حقوق کا تحفظ کیا بلا ہے؟ ــــــ بس یہیں چھپا ہوا ہے وہ نکتۂ لطیف جو موضوع بحث ہے۔ افراد ایک طرف مطمئن زندگی بسر کرنے کے لیے فطرۃً اجتماع کا رکن بن کر رہنے پر مجبور ہیں مگر اس کے باوجود وہ فرد بھی رہتے ہیں اور بہ حیثیت فرد وہ خود غرض واقع ہوئے ہیں۔ "کم سے کم محنت اور زیادہ سے زیادہ آرام" کا داعیہ انھیں سکھاتا ہے کہ اپنے سے کمزور کی جان لینے سے اگر اسباب عیش حاصل ہو سکیں تو "ہتے می بایست"۔ اگر ایک آدم زادہ کو لوٹ لینے سے ہفتہ بھر کے لیے غذا مل جائے تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ اگر صنفی جذبہ کی انار کی "نت نیا معشوق" طلب کرتی ہے تو جانوروں کی طرح خاندانیت کی حدود کو پھاند و اور دوسروں کی بیویوں سے ناجائز تمتع کر گزرو۔ پھر جذبات کی جمعیت اپنے مطالبات منوانا چاہتی ہے۔ غضب کہتا ہے کہ ذرا سی بات اگر کوئی خلاف مزاج کہے تو اس کا سر کچل ڈالو۔ انتقام کہتا ہے کہ اگر کوئی ایک سنائے تو تم سے دس سناؤ۔ حسد کہتا ہے کہ کسی کو بہتر حالت میں دیکھو تو اسے کچا چبا جانے کی فکر کرو۔ غرور کہتا ہے کہ جو سر تمھارے سامنے نہ جھکے اسے دھڑ سے

ساتھ لگا نہیں رہنا چاہئے۔ نفرت کہتی ہے کہ جو میری زد پر آجائے اسے کرۂ ارضی پر رہنے کا حق نہیں ملنا چاہیے۔ الغرض انفرادیت طوفانی مزاج واقع ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کی مانی جائے تو اجتماعی نظم نہیں رہتا اور اجتماعی نظم کے بغیر ابن آدم کرۂ ارضی پر جی بھی نہیں سکتا۔ بس "درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ" فطرت کی اس "تختہ بندی" نے حضرت انسان کو تحفظ حقوق کا ایک گر سکھا دیا اور انھوں نے اپنے نفس کے دو رخے مطالبات میں توافق پیدا کرکے ایک "معاہدۂ عمرانی" کی پابندی شروع کی اور طے کر دیا کہ "فرد" کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے اور اس معاہدہ کے تحفظ کے لیے ایک اقتدار کی بنا رکھی جو اجتماعی قوت کے زور سے کام کرنے لگا۔ اس اقتدار کو اوائل میں ایک فرد میں مرکوز کیا گیا اور آجکل چند افراد کی ایک باڈی کی تحویل میں دیا جاتا ہے۔ پھر اس اقتدار نے اپنے فرائض کو بہتر طور پر سرانجام دینے کے لیے رفتہ رفتہ بے شمار ضمنی ادارات کے پرپرزے نکالنے شروع کر دیے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ادارۂ حکومت خود کیوں اور کیسے مقتدر افراد کی خود غرضیوں کا آلۂ کار بنتا اور اصول توافق کے گلے پر چھری پھیرتا ہوا اندرونی تنازع کا محرک بن جاتا ہے اور انبیاء نے اس کی بنیادی کمزوری کی نشاندہی کس طور سے کی اور اس کی اصلاح کے لیے کیا پروگرام پیش کیا۔ یہاں صرف اس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ سوسائٹی کی تشکیل کے لیے قانونی نظم ایک لازمہ ہے اور اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک فرد دوسرے افراد کے حقوق کا پاس کرنے کا پابند ہو، دوسرے اس کے لیے ایثار کریں وہ دوسروں کے لیے قربانی کرے، دوسرے اس کی ضروریات پوری کریں وہ دوسروں کی خدمت میں لگا رہے۔ اور اسی معاونت کو توافق للبقا سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علیٰ ہذالقیاس اخلاقی شعور بھی اپنی ابتدائی حقیقت کے اعتبار سے ایک قانونی نظم ہی ہے۔ جہاں قانون کسی مادی اقتدار کے زور سے نہیں چل سکتا وہاں انسان کی اخلاقی حس کام کرتی ہے۔ اور یہ حس ہر دور میں خدا پرستی سے تقویت پکڑتی رہی ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو ایک غیر مادی اقتدار کے پنجے میں بے بس جاننا اور اس کے آگے ذمہ داری وجوابدہی کا احساس کرنا اسے نوع انسانی کا ایک بے مزد خادم بناتا ہے۔ ملحدین چاہیں تو اس حقیقت سے انکار کر دیں کہ خداپرستی اخلاقیت کے لیے لازمی نہیں ہے تو بھی وہ خود اخلاقیت کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے اور اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ یہ افراد کو متوافق بنانے کا ایک ذریعہ ہے اور ان کی انفرادی اغراض کے تاروں کو ہم آہنگ کرکے اجتماعیت کے ساز کو امن واطمینان کے نغمے اگلنے کے قابل بناتا ہے۔ کوئی صاحب عقل اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آدمی میں بھوک، پیاس اور شہوت کے محرکات کے ساتھ ایک تیسرا داعیہ "خدمت خلق" کا بھی موجود ہے۔ وہ اپنی فلاح کے ساتھ دوسروں کی فلاح بھی چاہا کرتا ہے۔ وہ بعض اوقات ذاتی مفاد اور اغراض کو دوسروں کے لیے قربان کرتا ہے۔ وہ فاقہ کشی کر گزرتا ہے، وہ صنفی لذت اندوزی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے، وہ عزت کی متاع گراں بہا لٹا دیتا ہے، وہ لاٹھیاں کھاتا ہے، وہ جیلوں میں سڑتا ہے، اور وہ پھانسیوں کے تختہ پر مسکرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیا ان ساری حرکات کے لیے انسانی نفس میں کوئی داعیہ ہے ہی نہیں؟ ـــــ یقیناً ہے اور اسی کی تربیت الہامی مذاہب کے مدنظر رہی ہے۔

خیر تو یہ قانونیت اور اخلاقیت رفتہ رفتہ اپنا دائرہ پھیلا رہی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ جنگ جسے قانون کی سرحد سے باہر رکھا گیا تھا وہ بھی قانون کا موضوع بن گئی ہے اور اس کے لیے بھی کچھ ضوابط کھڑے کیے گئے ہیں۔ مانا کہ قواعد حسب توقع مفید اور دیرپا ثابت نہ ہوئے مگر یہ انسان کے ذوق توافق کا ایک بین ثبوت ضرور ہیں۔

پھر سیاسی معاہدات کو لیجیے۔ یہ بھی توافق للبقا کا ایک نمایاں مظہر ہیں۔ جہاں دو قوموں میں تصادم کے امکانات پیدا ہوتے ہیں وہاں فوراً توافق کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے اور تصادم کو روکنے کے لیے سیاسی عہدناموں سے مدد لی جاتی ہے۔ ان سے حقیقی فائدہ اس وجہ سے حاصل نہیں ہو سکا کہ مساعی توافق کے اندر جو روح کام کر رہی ہوتی ہے وہ قومی خود غرضی کی روح ہوتی ہے جو آدمی کو آدمی سے لڑانے کے رہتی ہے

علاوہ بریں اقوام ابھی تک اپنے اوپر کسی "اقتدار بالادست" کی قائل نہیں ہیں جو ان کے اندر احساس ذمہ داری پیدا کرے اور اسے برسرِ عمل رکھے۔

یہاں مناسب ہوگا کہ جمعیت اقوام "مرحومہ" کو بھی یاد فرمالیجیے۔ یہ ادارہ بالکل اسی اساس پر قائم ہوا تھا جس پر افراد سوسائٹی کی تعمیر کرتے ہیں۔ یعنی حقوق کی تحدید اور ان کا احترام۔ عام سوسائٹی افراد کے حقوق و احترام کے لیے وجود میں آتی ہے۔ اور "جمعیت اقوام" اقوام کے حقوق و احترام کے لیے تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ اس کا مقصد فکری طور پر تو یہ تھا کہ دنیا کی قوموں کی حرکات پر ایسی بندشیں لگا دی جائیں جو توافق کو عالمگیر بنا دے۔ مگر چونکہ اس ادارہ کے اعضا اور کارکن وہی لوگ تھے جو قومی حیثیت سے بین الاقوامی تنازع میں شریک تھے اس وجہ سے یہ ادارہ کفن دزدوں کی تنظیم سے زیادہ کچھ نہ بن سکا۔ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کی فطرت اسے جس طرح قبائلی توافق سے قومی توافق کی طرف بڑھانے میں ممد ہوئی تھی اسی طرح وہ اب اسے قومی توافق سے بین الانسانی توافق کی طرف دھکیلنا چاہتی ہے مگر انسان جانتے بوجھتے ہوئے پشت بہ منزل چل رہا ہے۔ بین الانسانی توافق کی طرف بڑھنا تو کجا وہ الٹا قومی توافق میں بھی طبقاتی اور گروہی نزاع کو ارتقاء کا راستہ مانے لے رہا ہے اسی سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ارتقائے تہذیب غیر منقطع (Ceaseless) نہیں ہے بلکہ ارتقاء کے ساتھ ساتھ انحطاط بھی ہوتا رہتا ہے۔

بہر حال یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ یہاں تو یہ بات گوش گذار کرنی مطلوب ہے کہ سوسائٹی کا نشوو ارتقا تمام تر توافق کے بل پر ہوتا ہے اور تنازع صرف محرکِ تغیرات کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ جہاں تنازع کی کارفرمائی نے پاؤں پھیلائے اور توافق کا دائرہ تنگ ہوا، ارتقاء رک جاتا ہے۔

فلسفۂ اضداد پر جن لوگوں کی نظر ہے ان کے لیے تو "توافق" کے اصول پر ایمان لانا ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے کہ "تنازع" کی بھی کوئی ضد ہونی چاہیے اور دونوں کا انسانی زندگی میں عمل دخل ہونا چاہیے۔ پھر فلسفۂ اضداد ہی کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اضداد میں کلی ضدیت نہیں ہوتی بلکہ یکسانیت بھی ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں ضدیت محرک تصادم ہوگی وہاں یکسانیت محرکِ توافق بھی ہوگی۔ چنانچہ طبعیات میں دو عناصر کے ملاپ پر جو عمل و ردِ عمل نمودار ہوتا ہے وہ ضدیت کے پیدا کردہ تصادم ہی کا نتیجہ ہوتا ہے مگر اس عمل و ردِ عمل کو ایک بہتر نتیجہ کی طرف لے جانے کا فرض یکسانیت کے بل پر کام کرنے والا توافق انجام دیتا ہے۔ بالکل یہی حال نوعِ انسانی کا ہے۔ اس کے اندر جو جماعتیں اور قومیں اور افراد پائے جاتے ہیں ان میں جو اختلاط اور ترکیب کا عمل ہمہ وقت جاری ہے اس میں بھی ایک طرف تو اختلافات زور کرتے ہیں اور تصادمی عمل شروع ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ دوسری طرف ان میں جو نوعی یکسانیت اور دوسرے "یکی" کے رشتے ہیں وہ تصادمی عمل کو توافق کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ خود آدمی کے نفس میں رجحانات کے اضدادی جوڑوں کا حال بھی بالکل یہی ہے۔ وہ محرکات کے اکسانے سے جوڑا جوڑا ہو کر ابھرتے ہیں اور ان میں تصادم ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ توافق انھیں کسی راہ اعتدال پر ڈال دے۔

ان شواہد کے ہوتے ہوئے جن لوگوں نے "تنازع للبقا" کا صور پھونکا ہے اور انسان کو یہ اذیت دیا ہے کہ بقا و ارتقا در اصل مجرد تصادم کے عمل سے ممکن ہے، ان کا قصورِ فہم کتنے خطرناک نتائج کی طرف لے جا سکتا ہے۔ بخلاف ان کے الہامی مذہب کی دعوت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ نظمِ کائنات اور انسان کے مابین جو کشمکش جاری ہے وہ زندگی کے لیے بہ حیثیت داعیۂ حرکت کافی ہے مگر اس حرکت کو ارتقائی حرکت بنانے کے لیے نوعی توافق ناگزیر ہے۔ مغربی فلسفہ یہ کہتا ہے کہ انسانی افراد اور جماعتیں اور گروہ دوسرے افراد اور جماعتوں اور گروہوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھیں بخلاف اس کے الہامی فلسفہ یہ کہتا ہے کہ آگے بڑھتے ہوئے دوسروں کو اپنے ساتھ کھینچ لے چلو۔ نظمِ فطرت میں اپنے لیے ایک بہتر مقام حاصل کرنے کی مہم سر کرنی ہے تو پوری نوعی طاقتیں جمع کر کے آگے بڑھو اور اندرونی تصادم و تنازع کا قلع قمع کیے بغیر یہ ممکن نہیں۔

کیا بین الانسانی تنازع ناگزیر ہے؟ اب ہمارے سامنے صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آیا "برادرستیزی" و برادرکشی کی بلا فطرت کی طرف سے بہ جبر ہم پر نافذ ہے اور ہم اس کے پنجہ سے کسی طرح رہائی نہیں پا سکتے یا حقیقت اس کے برعکس ہے؟ اس سوال کا دھندلا سا جواب گذشتہ مباحث کی روشنی میں دیا جا چکا ہے مگر یہاں اس پر مختصراً ایک مستقل بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

نظام فطرت آئینی وجبری ہے! ـــــ اس میں تو کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کے مقابلہ میں انسان کے اندر جو ذوق تصرف اور جبر سے اختیار کی طرف بڑھنے کی خواہش رکھی گئی ہے وہ بھی نظم فطرت کا ایک جزیہ ہونے کی وجہ سے اتنی ہی اہم چیز ہے جتنی فطرت کی جبریت۔ یہ ایک قوت کی دو متضاد شاخیں ہیں جو آپس میں تصادم کرتی ہوئی توافق پیدا کرتی جاتی ہیں۔ فطرت کی جبریت انسان کے ذوق اختیار کو چیلنج کرتی ہے اور اس کے جواب میں انسان کا ذوق اختیار علوم وتحقیقات کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اس کا مقابلہ کرنے کھڑا ہوتا ہے، تا آنکہ توافق کی ایک راہ کھل جاتی ہے فطرت نے اپنے حریف کو جہاں بہت سی عضویاتی کوتاہیوں میں محصور کر دیا ہے وہاں اسے شعور جیسی عظیم الشان قوت دے کر انصاف کا حق ادا کر دیا ہے۔

زندگی ہے کیا چیز؟ خودی کا ظہور اور اس کا نشو وارتقا۔ یہ ظہور اور نشو وارتقا ممکن ہی صرف اس ماحول میں ہوتا ہے جو ناسازگاری اور سازگاری دونوں صفتوں سے آراستہ ہو۔ اگر نری سازگاری ہی اس میں پائی جائے اور کسی وجود کو چیلنج کرنے کے لیے کوئی "ضد" ہی میسر نہ آئے تو پھر خودی میں ذوق ظہور ونمود کا عمل ہی ممکن نہیں۔ "حکیم امت" نے خوب فرمایا ہے:-

از بلاہا پختہ می گردد خودی ۔۔۔ تا خدا را پردہ در گردد خودی

"امتحان وابتلا" جسے قرآن میں "فتنہ" سے تعبیر کیا گیا ہے، ذریعہ ووسیلہ ہے زندگی کے خوب وزشت کے ظہور وارتقا کا۔ اگر ندی کی راہ میں چٹانیں حائل نہ ہوں تو وہ اپنی قوت کا مظاہرہ نہ کر سکے اور اس کی موجیں خوفناک آوازیں اور نورانی جھاگ پیدا کرنے کے آرٹ سے کبھی واقف ہی نہ ہوں۔ اگر تاریکی کا وجود نہ ہو تو سورج اور چاند اور ستارے اور "پیر صاحب" کے گھر کا "تجلی کا چراغ" اور "مرید" کے گھر کا "مٹی کا دیا" اپنے وجود کو کبھی نمایاں نہ کر سکیں۔ اگر حرارت کو نگل لینے کی استعداد موجودات میں نہ ہو تو آفتاب اور آگ دونوں گرمی خارج نہ کرنے پائیں۔ الغرض حیات کا ظہور "مزاحمت" کا محتاج ہے۔ دوسری طرف اگر ماحول میں ایک حد تک "سازگاری" موجود نہ ہو تو بھی ظہور وارتقائے حیات ممکن نہیں۔ موجودات کو ظہور کے لیے جو وسائط ووسائل چاہئیں وہ موجود ہونے چاہئیں۔ مزاحمت کا کام صرف قویٰ کو اکسا دینا ہے مگر قویٰ کا مسلسل عمل سے نتائج پیدا کرنا سازگاری احوال پر منحصر ہے۔ سورج سے روشنی کا جو سیلاب بہتا ہے اگر اس کے لیے ابھر رودگاہ نہ بنے تو وہ کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ دانہ جن مزاحمتوں سے اشتعال پا کر پھوٹ نکلتا ہے ان کے ساتھ اگر ہوا، روشنی، حرارت، پانی اور غذائی عناصر کا تعاون کام نہ کرے تو وہ اپنی قبر سے کبھی ابھر نہ سکے۔ الغرض "راہ حیات" تصادم اور توافق اور جبر واختیار کے بین بین ہو کر گذرتی ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ فطرت نے آدمی کو ننگا پیدا کیا اور دوسری طرف موسموں کے تلخ طبیعی اثرات کے لشکروں کو اس کے خلاف ہنکا دیا۔ انسان کے شعور نے ان قہری احوال کو بے ضرر بنا دینے کے لیے لباس ایجاد کیا۔ فطرت نے اسے فرد پیدا کیا اور دوسری طرف ایسا ماحول اس کے گرد پھیلا دیا جو خطرات سے لبریز تھا اور اس کی ضروریات زندگی کو وسیع کرتے رہنے والے ذہنی عوامل اس کے اندر رکھ دیے۔ ان مشکلات کا مداوا انسانی شعور نے یہ کیا کہ اجتماعی زندگی کی عمارت کھڑی کر لی۔ پھر دیکھیے کہ فطرت نے انسان کی افزائش نسل کے تیز رفتار انتظامات کیے اور اس کی نسل کو زمین میں منتشر ہو جانے پر مجبور کر دیا مگر انسان کی عقلی قوتوں نے ایسے ایسے وسائل رسل ورسائل ایجاد کیے کہ انتشار میں شیرازہ بندی کی شان پیدا ہو گئی۔ الغرض پورا تمدن فطرت اور انسان کی کشمکش کی ایک طویل داستان ہے اور فطرت نے اس کشمکش کا دروازہ اسی لیے

کھولا ہے کہ انسان ارتقا کر سکے۔ یہی تنازع للبقا کی اصل شکل ہے۔ اب چونکہ فطرت مزاحمت کے ساتھ تعاون سے بھی کام لیتی ہے اس لیے ہم زندگی کے ہر معاملہ میں اس پر فتح پاتے چلے جا رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں "تنازع للبقا" کا فطری قانون ہی ایسا قانون مانا جائے جس کے آگے خاموشی سے سر ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟ کیوں اس کے مضرات کو چپ چاپ سہا جائے اور کوئی کروٹ نہ لی جائے؟ یہاں اگر مغرب کا عقل پرست "ارجن" میدان جنگ سے بھاگنا چاہتا ہے اور یہیں اسے کسی خدا پرست "کرشن" کے ایک "رجز یہ اپدیش" کی ضرورت ہے۔ ہم فطرت کے دوسرے طبیعی قوانین کے خلاف جتنا زور لگاتے ہیں اس سے زیادہ قوت ہمیں "تنازع للبقا" کے قانون کے خلاف استعمال کرنی چاہیے اور اپنی نوعی زندگی کو توافق للبقا کی پناہ میں لے آنا چاہیے ورنہ ہم پر امن و راحت کی نئی دنیا کے دروازے کبھی نہ کھلیں گے۔

کتنا تعجب انگیز امر ہے کہ یورپ جو طبعیات کے میدان میں فطرت کے آگے جھکنے کو گناہِ کبیرہ سمجھتا ہے وہ تہذیبی میدان میں اس کے خلاف کوئی جنبش نہیں کرنا چاہتا اور اس سے یہ مطالبہ کرنے پر تیار نہیں ہے کہ تجھے انسان کے ساتھ متوافق ہونا پڑے گا۔ دورِ تاریکی کے مصر میں جیسے دریائے نیل پر ہر سال ایک "کنواری" بھینٹ چڑھائی جاتی تھی بالکل اسی طرح یہاں قانون تنازع للبقا کی چوکھٹ پر قومیں اور جماعتیں، طبقات اور افراد چپ چاپ ذبح کر دیے جاتے ہیں اور کوئی نہیں سوچتا کہ اس رسم جاہلیت کو کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔

حقیقتہً یہ نتیجہ ہے ناجائز انتفاع کی اس نیم شعوری خواہش کا جو جدید تہذیب کی گود میں پلے ہوئے ہر فرد کے دماغ میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ یہ خواہش خود علوم میں بری طرح سرایت کر گئی ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انفرادی طبقاتی اور قومی کشمکش جاری رہے۔ کمزور پستے رہیں اور زور دار ظلم کی چکی چلاتے رہیں۔

تنازع للبقا کا نظریہ، جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے، ظالم قوتوں کے لیے ان کی ناپاک حرکات میں تقدس کی شان پیدا کرتا ہے اور اسے نیکی کی سطح پر لے آتا ہے۔ دوسری طرف مظلوم قوتوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم اگر کچلی جا رہی ہو تو اس وجہ سے نہیں کہ کوئی انسانی قوت بطور خود اس کی خواہش رکھتی ہے اور ارادۃً ایسا کر رہی ہے بلکہ یہ جفا پیشہ قوتیں ایسا کرنے پر عین فطرت کے دباؤ اور تقاضوں سے مجبور ہیں۔ یہ انسانی بھیڑیے کیا کریں جبکہ انھیں فطرت نے آدم خواری ہی کے لیے پیدا کر دیا ہے اور انھیں چیرنے پھاڑنے والے دانت اور پنجے فراہم کر دیے ہیں۔ یہ بیچارے نہ اپنی خواہشات کو اور نہ اپنے اوزاروں کو بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ پھر ان کا کیا قصور؟ —— علاوہ بریں تمھیں یہ اطمینان بھی رکھنا چاہیے کہ ضعیفی کے جرم کی وجہ سے اگر تمھیں "مرگ مفاجات" کا سامنا بھی کرنا پڑے تو یہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہے کیونکہ اس کے بدلے میں فطرت انسان کے نوعی ارتقاء کا تسلسل قائم رکھتی ہے!

صاف بات ہے کہ "تنازع" کے فریقین عالم طبیعی اور انسان ہونے چاہئیں نہ کہ انسان اور انسان۔ انسان کی فطرت تو شروع سے اس تنازع کو دائرۂ تمدن سے باہر دھکیلنے کی طرف مائل رہی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح بدن کی قوت مدبرہ بیماری کو باہر دھکیلتی ہے۔ اس نے انسانیت کی حفاظت کے لیے اول اول آوارہ گروہوں اور کنبوں کی قلعہ بندیاں کیں، پھر بستیوں اور قبیلوں کے حصار کھینچے۔ پھر ملکوں اور قوموں کی دیواریں کھڑی کیں اور اب اسی کا تقاضا ہے کہ پوری انسانیت کو توافق کے رشتہ میں پرو کر مساوات و اخوت کے حصارِ آہنیں میں محفوظ کر دیا جائے۔ بدقسمتی کہ قبیلوی دور کی قلعہ بندیاں مدتوں پہلے ٹوٹ کر کھنڈر بن گئیں، قومی قلعوں کے چور دروازے بھی غداران انسانیت نے "تنازع" کے لشکر پر کھول دیے، اور اب یہی لوگ ایک نئے حصار آہنی کی تعمیر میں حائل ہو رہے ہیں۔

اگر انسانیت اپنی اندرونی آویزشوں سے فرصت پا سکی ہوتی تو ہم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ تسخیرِ کائنات کی مہم کس منزل پر ہوتی۔ ہمارا

علم افلاک، علم کیمیا، علم آلات، علم نفس، علم اعضا، علم امراض، علم ادویہ اتنی ترقی کر چکے ہوتے کہ زندگی کی ناخوشگواریاں بیشتر ختم ہو چکی ہوتیں۔ شاید انسان بے پر اڑتا نظر آتا، شاید آلات کے بغیر وہ دور دراز کی آواز بھی سن سکتا، شاید وہ پہاڑوں کو ایک اشارے سے اٹھا کر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر حرکت دیتا نظر آتا، شاید یہ مشت خاک چاند اور مریخ اور مشتری کی سیر کر چکی ہوتی ـــــ مختصر یہ کہ دنیا کیا سے کیا ہو چکی ہوتی۔ مگر اس احمق مخلوق کو "خودکشی" کا جو سودا سمایا ہوا ہے اور جو اسے اپنی ہی نوع سے لڑنے بھڑنے کا فن سکھاتا ہے اس کی چاٹ کا کیا علاج؟ اسے صحیح معنوں میں تسخیر کائنات کی فرصت ہی کب ملی؟

بہر حال مدعا یہ ہے کہ تہذیب کی روانی میں فطرت کی جباری کار فرما دیکھنے والے لوگ وہی ہیں جو اپنی خواہشات کو ہر اجتماعی اور اخلاقی بندش سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں اور اس آزادی کے ذریعہ نوع انسانی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے آرزومند ہیں۔

شاید اس "جبری تصادم" سے زیادہ خطرناک کوئی نظریہ ہماری تحقیقاتیں فراہم نہ کر سکی ہونگی اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ مذہب عقلیت کے متعصب پادریوں کا طلسم توڑنے میں ذرا کوتاہی نہ کی جانی چاہیے۔ یہ پادری شہر تہذیب کے چوراہوں پر سائنس کی انجیلیں لیے اکثر وعظ کہتے نظر آتے ہیں مگر ان کے وعظ خود ان کی انجیلوں کے خلاف ہیں۔ یہ فطرت کی آیات کو جوں کا توں پیش نہیں کرتے بلکہ ان میں اپنی خواہشات کے مطابق تحریف کرتے ہیں اور محرف آیات کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ یہ ہے دین فطرت!

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۔ ط

ضروری اعلان

گزشتہ پرچے میں مکتبہ جماعت اسلامی کی جن کتب موجودہ کی فہرست شائع ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل مزید کتب چھپکر آگئی ہیں۔ ضرورت مند حضرات طلب فرما سکتے ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم	عہ ۸/	مولانا سندھیؒ کے افکار و خیالات پر ایک نظر (از مولانا مسعود عالم ندوی)	عہ ۱۲/
روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	۹/	قرآن اور پیغمبر	۵/
جہاد فی سبیل اللہ	۴/	مسلمان کا بنیادی عقیدہ (چارٹ کی صورت میں)	۲/
نشان راہ	۶/	عبادت	۲/
مسلمان کسے کہتے ہیں؟	۲/	ایمان کی کسوٹی	۲/
خدا کی اطاعت کس لیے؟	۲/	پردہ (مجلد) ۸/ (غیر مجلد)	عہ ۸/
خطبۂ تقسیم اسناد	۲/	تفسیر سورہ قیامہ (از مولانا حمید الدین فراہیؒ)	۸/
مسلمانوں کی طاقت کا اصلی منبع	۲/	کلمۂ طیبہ کے معنی	۲/
		اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶/

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جماعت اسلامی۔ دارالاسلام ۔ جمالپور

پٹھانکوٹ۔ (پنجاب)